سکتے ہیں اور وہ ورثہ انسانیت کا ہے اور انسانی محبت، مروت اور ایثار و قربانی کا ہے۔ نظیر نے ایک وسیع الفکر معلم
کی حیثیت سے اپنی قوم کو اپنی کئی نظموں میں دعوت دی ہے، جس کا ذکر آگے مقامات پر آئے گا۔

اخلاقی حالت، پند و موعظت، مکارمِ اخلاق کا تصور:

نظیر نے ایک مفکر اور معلم کی حیثیت سے معاشرے کے اچھے اور برے پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے
اپنے قارئین کے سامنے جس واقعہ یا جس حالت کو بھی پیش کیا ہے، اس کے کوائف و اسباب کی وضاحت کر کے اور
پھر پند و موعظت سے بھی کام لیا ہے۔ نظیر کی شاعری کے اس مقام پر پہلو کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بھی نظر آئے گا کہ نظیر
نے بالواسطہ نصیحت کو بلا واسطہ نصیحت پر ترجیح دی ہے۔ یہ طریقہ اس طریقِ کار کا سنگِ راہ اور کارگر ترین حربہ ہے۔
مثال کے طور پر نظیر نے ایک نظم ہندوؤں کے مشہور تہوار دیوالی پر لکھی ہے۔ اس میں دیوالی کے جو جو سامان اور
لوازمات ہوتے ہیں، ان کا بڑے دلچسپ پیرائے میں ذکر کرتے ہوئے انھوں نے دیپ جلا کے ایک تاریک رخ
بھی جوئے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جوئے کے مصائب اور بازیگر کی حالت میں جواریوں کی کیفیت بیان کرتے
کے بعد معاً انھیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی بھی رائے میں جواریوں کو ناگوار گزریں گی۔ فوراً معاملہ بدل اتار کر طور
بھی انھی کی صف میں جا شریک ہوتے ہیں تاکہ انھیں اس بات کا احساس ہی نہ ہو کہ ناصح کوئی سلجھا ہوا انسان ہے۔ بلکہ
وہ یہی سمجھیں کہ "یار اس طریقت" ہی میں سے کوئی حقیقت حال کا پردہ فاش کر رہا ہے:

یہ باتیں سچ ہیں نہ جھوٹ ان کو جانیے یارو — کہتے ہیں انھیں دل سے مانیے یارو
جہاں کو جاؤ یہ قصہ بکھانیے یارو — جو جواری ہو نہ برا اس کا مانیے یارو
نظیر آپ بھی ہے جواری دیوالی کا

پند و موعظت کی اس روش سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر نفسیاتِ انسانی کے ماہر تھے۔ وہ کبھی بے موقع نصیحت نہیں
کرتے، لیکن کسی مناسب موقع کو ضائع بھی نہیں جانے دیتے۔ اس پند و موعظت کے بارے میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا
کہ یہ باتیں کسی واعظ یا ناصح کی زبان سے نکل رہی ہیں۔ بلکہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ایسا ہے الف "یار آشنا"
ہمدردی سے یہ باتیں کہہ رہا ہے جو راز ہائے درونِ پردہ سے پوری طرح باخبر ہے، اور پھر کہنے اور سننے والے کے
درمیان تعلقات کے کوئی پردے بھی حائل نہیں۔ بڑی بے تکلفی سے باتیں ہو رہی ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد
میں ہاتھ بٹایا جا رہا ہے۔ نظیر نے اس طریق سے دو فرض ادا کیے ہیں۔ ایک تو معاشرتی برائیوں کا ذکر کر کے ان
قباحتوں کا پردہ فاش کیا ہے، جو معاشرتی زندگی میں ناسور بن چکی تھیں اور دوسرے ان قباحتوں سے عام لوگوں کو خبر
دار کر کے انھیں شر سے بچنے اور ماحول سے بچنے کی تلقین و ہدایت کی ہے۔

نظیر کے عہد میں تھگی اور قزاقی کا ہندوستان بھر میں ایک عظیم جال بچھا ہوا تھا۔ مسافروں اور راہ گیروں
کے لیے کوئی گوشہ عافیت باقی نہ رہا تھا۔ شاہراہیں اور گلیاں سرائیں، سب تھگوں اور قزاقوں کی شکار گاہیں

بنی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ جس طرح ہمدرد اور مشفق بن کر پہلے مسافروں کے دل میں جگہ بناتے تھے اور پھر ان کا گلا گھونٹ، نقد و سامان پر قبضہ جما، اپنی راہ لیتے تھے، اس کا سرسری سا تذکرہ ہی رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایسی وحشیانہ، بھیانک اور خونیں داستانوں سے اس عہد کی تاریخ کے اوراق بھی فیوض آباد ہیں۔ لارڈ ولیم بنٹنک کے عہد حکومت (۱۸۲۸۔۱۸۳۵ء) میں وحشت و بربریت کے اس الم ناک کھیل کا انسداد ہوا۔ شیخ کی نظروں نے ان وحشیانہ افعال و حرکات کو صرف شاہراہوں پر یا کارواں سراؤں ہی میں نہ دیکھا بلکہ انھیں بستیوں اور آبادیوں میں، دوستوں اور مشفقوں، یاروں اور رفیقوں کی مجلسوں میں بھی انہی بھیانک واقعات کا پرتو اور اسی الم ناک کھیل کا عکس نظر آیا۔ مکر و دغا، جھوٹ فریب، کینہ و بغض، جعل سازی و ریاکاری کا جال دوستوں کی مجلسوں میں بھی بچھا ہوا دیکھ کر نظیر کو دوستوں کی دوستیوں، مشفقوں کی شفقتوں اور رفیقوں کی رفاقتوں کی پرفریب حالت کا رونا بھی رونا پڑا۔ ایک مسدس میں انھوں نے معاشرے کی اخلاقی حالت کے اس پہلو کی عکاسی کر کے اپنے سامعین کو گرد و پیش سے باخبر اور ہوشیار رہنے کی تلقین و ہدایت کی ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

کیا کیا فریب کہیے دنیا کی فطرتوں کا — مکر و دغا و دزدی ہے کام اکثروں کا
جب دوست مل کے لوٹیں اسباب مشفقوں کا — پھر کس زباں سے شکوہ اب کیجیے دشمنوں کا
ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں تک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

گر دن کو ہے اُچکا تو چور رات میں ہے — نت کھٹ کی کچھ نہ پوچھو ہر بات بات میں ہے
اس کی بغل میں گپتی، تیغ اس کے ہات میں ہے — وہ اس کی فکر میں ہے یہ اُس کی گھات میں ہے
ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں تک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

اس راہ میں جو آیا اسوار گھہ کے گھوڑا — ٹھگ سے بچا تو آگے قزاق نے نہ چھوڑا
سویا سرا میں جا کے تو چور نے جھنجوڑا — تیغا رہا نہ بھالا گھوڑا رہا نہ کوڑا
ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں تک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

ناداں کو پلا کر اک بھنگ کا پیالا — کپڑے بغل میں مارے اور لے لیا دوشالا
دانا ملا تو اس میں گھولا دھتورا کالا — ہوتے ہی غافل اس کو پھانسی میں کھینچ ڈالا
ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں تک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

Scanned with CamScanner

نکلا ہے شیر گھر سے گیدڑ کا گوشت کھانے — گیدڑ کی ڈھن لگاوے خود شیر کو کھانے
کیا کیا کرے ہیں باہم مکر و دغا بہانے — یاں وہ بچا نظیر اب جس کو رکھا خدا نے
ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

اخلاقی حالت اور پند و موعظت کے بیان میں عملی اور اثباتی رنگ بھرنے کے لیے نظیر نے مکافاتِ عمل کے عقیدے کا سہارا بھی لیا ہے جو مشرق کی روحانیت پسند فضا میں معاشرتی اصلاح کا ایک مؤثر ذریعہ رہا ہے:

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

کارخانۂ قدرت کا نہیں ہاتھ اس عملِ مکافات میں بڑی تیزی سے شب و روز مصروف کار رہتا ہے اور ظالموں اور مجرموں کو علی العموم دنیا ہی میں ان کے مظالم اور جرائم کی سزا دے کر کیفرِ کردار تک پہنچا دیتا ہے۔ نظیر نے اس عقیدے کو اخلاقی پند و موعظت کے سلسلے میں بطور ایک حربے کے استعمال کیا ہے اور اس سے معاشرتی برائیوں کی روک تھام میں مدد لی ہے:

جو اور کا اونچا بول کرے تو اس کا بول بھی بالا ہے۔
اور دبے پٹکے تو اس کو بھی کوئی اور پٹکنے والا ہے
بے ظلم و خطا جس ظالم نے مظلوم ذبح کر ڈالا ہے
اس ظالم کے بھی لوہو کا پھر بہتا ندی نالا ہے
کچھ دیر نہیں، اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے

فنا و بے ثباتی کا احساس، صبر و شکر کی تلقین:

نظیر کی شاعری اور اُن کا فلسفۂ حیات اپنے عہد کے منفیانہ رجحانات سے یکسر مبرا اور پاک و صاف نہیں ہے، بلکہ غم و الم کو حقیقت مان کر اُن کے نظریۂ حیات میں جو خوش طبعی اور زندہ دلی کا عنصر پیدا ہوا ہے، اس نے اسے بڑا صحت مند بنایا ہے۔ خوش طبعی کے باوجود نظیر نے فنا و بے ثباتی کے اس تلخ احساس کو نظر انداز نہیں کیا جو سیاسی حادثات کی بدولت معاشرتی زندگی میں غم و اندوہ کی ہمہ گیر صورت اختیار کر چکا تھا۔ جو باشعور انسان زندگی کو ایک میلہ یا تماشا سمجھ کر ہنستا اور ہنساتا ہوا انبوہوں اور مجمعوں میں سے گزر جاتا ہے، اس کی باریک بیں نگاہوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہوتی کہ یہ میلہ یا تماشا صرف چند ساعت کا ہے۔ جہاں ابھی ابھی چہل پہل، اُچھل کود، ہنگامہ ہاؤ ہو، لا اور پلا کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، تھوڑی دیر بعد وہاں مرگ نما سکوت طاری ہو جائے گا۔ اِدھر بجھی ہوئی آگ میں سے دھوئیں کے مرغولے اُٹھ رہے ہوں گے، اُدھر ٹوٹی ہوئی طناب اس بات کی گواہی دے رہی ہوگی کہ اس

Scanned with CamScanner

جام پر بھی تھوڑی دیر پہلے جشن حیات کے نوحہ بنا رہے تھے، لیکن اب نہ میلہ رہا اور نہ میلے والے رہے! نظیر کو زندگی کے ان عارضی ہنگاموں اور ان کے انجام کا پورا پورا احساس تھا۔ انہیں اس حقیقت کا بھی علم تھا کہ اتنا ہنگاموں میں کچھ لوگ ایسے ہیں، جن کو عیش و عشرت کے جملہ سامان میسر ہیں اور اکثر ایسے ہیں جو ہجوم یاس میں گھر کر جینے سے بھی عاجز آ چکے ہیں۔ نظیر عوام الناس (یعنی خاص و عام سب) کے شاعر تھے۔ لہٰذا انھوں نے ان نظریات کی تحی کو دھیما کرنے اور افراط و تفریط کی حدوں کو ہموار کر کے اعتدال ذہنی کا ایک ایسا راستہ لوگوں کو بتانے کی کوشش کی ہے کہ جسے دیکھ کر عملی نہیں تو ذہنی تسکین کا کچھ سامان ضرور فراہم ہو جاتا ہے۔ اگر زخموں کا اندمال ممکن نہیں، تو جراحت غم کا اتنا مداوا تو ہو ہی جاتا ہے کہ انسان شاعر کے فلسفۂ حیات، یعنی غم کو حقیقت جان کر حیات مستعار کی تلخیوں سے نباہ کا حوصلہ اپنے قلب و جگر میں محسوس کرنے لگتا ہے اور مسرت کے چند لمحے بھی اگر کہیں مل جاتے ہیں تو انہیں ضائع نہیں جانے دیتا، کیونکہ اس کے بغیر زندگی ایک الم مسلسل کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

نظیر نے اپنی شاعری میں فنا و بے ثباتی کے احساس کو متصوفانہ رنگ دینے کی کوشش نہیں کی، نہ ہی انھوں نے اس پر کسی گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے تلخ اور ناخوشگوار باتیں کہی ہیں۔ عبرت کا رنگ اس میں ضرور پایا جاتا ہے۔ کسی قدر تلخی رجحان بھی جھلکتا ہے۔ لیکن اس احساس میں انھوں نے معلمانہ تنبیہ و تادیب کے مثبت پہلوؤں پر زیادہ زور دیا ہے۔ نظیر کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی مؤثر حربہ تھا بھی نہیں کہ جس سے وہ انسانوں کے مختلف طبقوں اور گروہوں کو برابری اور مساوات کا سبق دے سکیں۔ لہٰذا انھوں نے فنا و بے ثباتی کے اس حربے سے بھی خاطر خواہ کام لیا اور انسان کی معاشرتی زندگی کے ان تضادات کو فنا اور موت کی بھٹی میں ڈال کر ہموار کرنا اور لوگوں کو یہ احساس دلانا چاہا کہ یہ سب دنیاوی مراتب و مناصب بے حقیقت ہیں۔ امارت و غربت کا سوال بے بنیاد ہے۔ دکھ تکلیف، سکھ چین، رنج و الم اور مسرت و انبساط محض عارضی اور ناپائے دار چیزیں ہیں۔ اگر کسی نے کچھ حاصل کر بھی لیا تو کیا فائدہ اور اگر کسی کی سعی و کوشش لاحاصل بھی رہی تو کیا غم..... دونوں کا انجام تو آخر ایک ہی سا ہے۔ حاصل اور لاحاصل دونوں انجام کار بے سود اور نقش بر آب ثابت ہوں گے!

نظیر نے معلمانہ انداز میں برابری اور مساوات کا یہ سبق اپنے قارئین کو دیتے ہوئے انہیں اس امر کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ نہ سامان عیش و نشاط کی فراوانی پر اتنا مغرور ہونا چاہیے کہ اپنی اصل حقیقت نظروں سے اوجھل ہو جائے اور نہ غربت و افلاس میں اتنا دل شکستہ اور رنجور ہو جانا چاہیے کہ زندگی کا پیمانہ کیف و سرور سے بالکل ہی خالی ہو جائے۔ نظیر کے اس درس حیات میں کوئی زیادہ گہرائی نہیں۔ نہ ہی اس میں اثبات کا کوئی ایسا پہلو ملتا ہے، جو عمومی دکھوں اور غموں کی تشخیص کر کے ان کا کوئی قابل عمل علاج تجویز کر سکے۔ اس بات کی توقع بھی نظیر سے نہیں کرنی چاہیے۔ نظیر کے عہد کے عام رجحانات کو دیکھتے ہوئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ نظیر نے ایک معلم اور شاعر کی حیثیت سے جو کچھ کہ ان کے بس میں تھا، وہی کیا۔ یعنی انھوں نے اعتدال ذہنی کا ایک ایسا راستہ لوگوں کو بتایا، جو ان کے زخموں کو مندمل تو نہ کرتا تھا، لیکن کسی حد تک تالیف قلوب کا سامان ضرور فراہم کر دیتا تھا۔

Scanned with CamScanner

گر مال دیا یار نے تو مال میں خوش ہیں
بے زر جو کیا تو اسی احوال میں خوش ہیں
افلاس میں ادبار میں اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

انسان کی معاشرتی حیثیت اور انسانی محبت کا عالم گیر تصور:

یوں تو نظیر کی بیشتر نظموں میں انسان کے مرتبے اور حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن ایک مخمس میں نظیر نے انسان یا آدمی کے مقام پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس لحاظ سے اس نظم کو نظیر کے افکار و خیالات کی بنیاد، اور اس کے مطلع کے بند کو اُن کے نظریۂ حیات کی کلید سمجھنا چاہیے:

دنیا میں پادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس نظم کے نفسِ مضمون اور لہجے کے دھیمے پن سے ظاہر ہے کہ یہ کسی سیاسی مصلح یا انقلابی رہنما کی آواز نہیں، بلکہ ایک ایسے دردمند اور حساس شاعر کی عاجزانہ و دردمندانہ صدا ہے، جو اپنے ماحول اور معاشرے میں انسانی قدروں کے زوال کو دیکھ کر بے حد متاثر و متالم ہے۔ یہ دردمندانہ صدا اس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہے۔ یہ صدا حقیقت افروز بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ اس میں دکھی انسانیت کی کرب ناک پکار بھی سنائی دیتی ہے۔ اس انسانیت کی جس کی بنا اعلیٰ تر شرافتوں اور بلند تر حقیقتوں پر رکھی گئی اور جس کی تخلیق کے مرتبے کو یہ کہہ کر "اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (قرآن ۲۔۳۰)" فرشتوں سے بھی بلند و برتر بتایا گیا ہے۔ بقول میر تقی میر:

آدمی سے ملک کو کیا نسبت
شان ارفع ہے میر انساں کی

لیکن اس بلند مرتبت ہستی کو حالات نے خیر و شر کی متضاد راہوں پر ڈال کر اس کے حقیقی مقام و منصب سے بہت دور پھینک دیا۔ انسانیت مختلف خانوں میں بٹ گئی۔ کائنات ارضی پر انسان ہی کے روپ میں قطب، غوث، ابدال اور اولیاء کرام جیسی برگزیدہ ہستیاں ظہور میں آئیں اور یہیں فرعون، شداد اور نمرود جیسے قاہر اور جابر بھی آدمی ہی کی شکل میں پیدا ہوئے۔ انسان ہی کی ذات کہیں نور مجسم بن کر اپنی تابناک کرنوں سے اقصائے عالم کو منور کرتی رہی اور آدمی ہی کہیں نارِ جہنم بن کر دنیا کے خرمنِ امن کو خاک و خون میں ملاتا رہا..... غرض کائنات ارضی کے حسن و قبح میں انسان کی ذات کو جو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اسے واضح کرنے کے بعد، نظیر نے اپنے معاشرتی ماحول کے کچھ مرقعے قارئین کے سامنے پیش کیے ہیں۔ یہ مرقعے جن میں حقائق و واقعات کا رنگ نمایاں ہے، بڑے خیال انگیز ہیں اور اُردو شاعری کے سیاسی اور سماجی میلانات کے سلسلے میں ان کی اہمیت بہت واضح ہے۔ ان کی تخلیق ایک

Scanned with CamScanner

ایسے زمانے میں ہوئی، جب عوام کے ذہنوں میں اجتماعی سیاسی شعور نے ابھی کروٹ بھی نہ لی تھی، اور زندگی کے ہر قدر پر جاگیردارانہ تصورِ حیات کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی۔ چند خواص اپنے آپ کو عام معاشرتی [illegible] سے بالاتر سمجھتے تھے، اور نان و نمک کو بھی محتاج عوام جاگیردارانہ نظام کی پیچ در پیچ بندشوں میں جکڑے ہوئے، تنگیِ حیات اور بندِ غم کے بوجھ تلے سسک رہے تھے۔ نظیر نے اس نظام کی لعنتوں کو پوری طرح محسوس کیا اور [illegible] کے اس طبقاتی تضاد کو ''آدمی نامہ'' میں بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار — اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
کھڑے صراحی خوتیاں دوڑیں بغل میں مار — کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں دوڑتے کہار
اور اس پہ جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل جواہر ہے بے بہا — اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ اُلٹا ہے جوں توا — گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا
بد شکل و بدنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کی یہ کچھ زرق برق ہیں — بوپے کے ان کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں — کمخواب، تاش، شال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ان ناروا طبقاتی امتیازات کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے حساس دل پر سخت چوٹ لگی ہے۔ لیکن اس چوٹ کا مداوا اُس کے بس میں نہیں اور نہ ہی اُس کے ذہن میں اس قسم کے خیال کا کوئی شائبہ ہی موجود ہے۔ تاہم ایک بات بالکل واضح ہے کہ شاعر کا دل احترامِ انسانیت کے جذبے سے لبریز ہے۔ وہ ہر انسان کو پیار و محبت کے علاوہ ہمدردی کی نظر سے دیکھتا ہے..... شاہ و گدا، مفلس و تونگر، زردار و بے نوا، نیک و بد، مومن و کافر، عاصی و عابد، رند و محتسب، پیر و مرید، عاقل و جاہل، حاکم و محکوم، خادم و مخدوم، مردود و مقبول، سب اس کی نگاہ میں ''آدمی'' ہیں۔ حالات نے انھیں مختلف راہوں پر ڈال دیا ہے۔ اگر کوئی ضلالت و گمراہی کی راہ پر جا نکلا ہے، تو وہ قابلِ نفرت و ملامت نہیں بلکہ لائقِ ہمدردی و افسوس ہے۔ ممکن ہے، کسی وقت اس کی انسانیت کے احساس خفتہ میں کوئی لہر آجائے، اور وہ سنبھل جائے۔ آدمی کی قدر و اہمیت معاشرتی زندگی میں بہر صورت قائم و برقرار رہتی ہے۔ اگر آدمی ہی آدمی کے لیے ظالم و جابر ہے تو آدمی ہی آدمی کو ظلم و ستم کے پنجے سے نجات بھی دلاتا ہے اور مصیبت کے وقت آدمی ہی آدمی کو پکارتا بھی ہے، لہٰذا یہ رشتۂ انسانیت ایک ایسی بدیہی شے ہے اور آدمی کا منصب و مقام اتنا عالی ہے کہ اس کی ضرورت و اہمیت کو کسی صورت میں بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ نظیر نے اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت جا بجا کی ہے۔ یہاں صرف ایک بند پیش کرنا ہی کافی ہوگا:

Scanned with CamScanner

مردوں میں میرے مرنے وہیں کا دھیان ہے تو ہو بھی میرے مرنے ہیں میں زبان ہے
ہے تو ہی باغ اور تو ہی باغبان ہے باغ و چمن ہیں جتنے تو اُن سب کی جان ہے
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

حاصلِ کلام:

نظیر کی شاعری کے سیاسی اور سماجی پس منظر کے مطالعے سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ نظیر نے معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک ہمدرد اور انسان دوست شاعر کی نظر سے دیکھا۔ اپنے عہد میں انسانی قدروں کے زوال اور بنی آدم کی عام بے قدری اور ذلت کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے ایک فرض شناس معلم اور ایک حساس و باشعور فن کار کی طرح لوگوں کو تلقین و ہدایت بھی کی۔ نظیر کی نظموں کا لب و لہجہ ظاہر کرتا ہے، کہ یہ نظمیں تنہائی میں مطالعہ کرنے کی بجائے عوام کے مجمعوں اور اجتماعوں میں پڑھنے اور سُنانے کے لیے کہی گئی ہیں۔ نظیر کی ان نظموں کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ سڑکوں اور بازاروں میں زبان زد عام ہو گئی تھیں۔ شیفتہ نے نظیر کی اس عام ہر دلعزیزی کو عامیانہ اور سوقیانہ کہا ہے (۸)۔ لیکن یہی بات دراصل نظیر کے حق میں چلی جاتی ہے۔ کیونکہ نظیر کی باتیں عام قلوب انسانی کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ تھیں۔ عوام الناس کے جذبات و احساسات کی ترجمانی نے معاشرتی نقطۂ نظر سے نظیر کا مقام بہت بلند کر دیا ہے۔ بایں ہمہ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے، نظیر اور اُن کے ہم عصروں میں کوئی زیادہ بُعد و اختلاف نہیں۔ تقریباً سبھی شعرائے اردو نے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی اختلال کو اپنے اپنے رنگ میں پیش کیا ہے اور اپنی رودادِ غم میں عام معاشرتی انسان کی حالت زار کا جائزہ لیا ہے اور اس جائزے میں اصلاح احوال کی جو جو صورت ان کے ذہن میں آ سکتی تھی، اُس کو بھی اپنے فن میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ منفی اور مثبت نظریات کی بحث یہاں لا حاصل ہے۔ کیونکہ کوئی مثبت نقطۂ نظر خود اس وقت کے معاشرے میں نہیں ملتا۔ یہ کہنا تو کسی صورت میں بھی درست اور مناسب نہیں کہ دوسرے شعرائے اردو محض گل و بلبل کے نغمے الاپ رہے تھے یا جاگیردار طبقے کی قصیدہ خوانی کر رہے تھے ..... اس کے برعکس انھوں نے بھی مقدور بھر مسائل حیات پر غور و فکر کیا اور اپنے افکار و اشعار کو معاشرے کے عام افراد تک پہنچانے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ بقول میر تقی میر

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفت گو عوام سے ہے

فرق صرف اتنا ہے کہ دوسرے شاعروں نے اپنے عہد کی رودادِ غم کو زیادہ تر آبگینۂ غزل میں پیش کیا ہے اور نظیر نے

Scanned with CamScanner